..... یہ کہاں بچیں کہ دل ہے

رفعت سراج

بنی اسرائیل کا سونے کا بچھڑا آج ڈالر، پونڈ، یورو، درہم و دینار کی شکل اختیار کر چکا ہے۔
دل جذبات کا استعارہ ہے مگر اب وہ دل کہاں . . .
سونے کے بچھڑے میں دل بھی سونے کا ہے . . .
دل کو رویا جاتا ہے، جگر کو پیٹا جاتا ہے . . .
کبھی ناقدروں کے حوالے کر دیا جاتا ہے، باربار ٹوٹ جاتی ہیں۔
الزام تراشیوں کا ایک طوفان بدتمیزی برپا ہو جاتا ہے۔
دل سے دل کو راہ بھی ہوتی ہے . . .
آج کا انسان یہ راہ سٹیلائٹ کے ذریعے search کرنے کی کوشش کرتا ہے۔
دل اور سونے کا بچھڑا . . .
عبادات، معاملات . . .
جنتِ گم گشتہ کے بے دخل باسیوں کی ازلی کہانی . . .

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا
ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

قسط 5

"عمر تو کم لگتی ہے..... خوش مزاج بھی ہے۔" لیڈی صوفیہ رف اسکیچ پر یوں تبصرہ کر رہی تھیں جیسے اہتمام سے کھینچی گئی فوٹو کا جائزہ لے رہی ہوں۔
پرنس تعجب سے لیڈی صوفیہ کو دیکھ رہا تھا۔
"آپ نے اسکیچ سے یہ اندازہ بھی لگا لیا کہ یہ خوش مزاج ہے؟" وہ حیرت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ پوچھ رہا تھا۔
"ہر وقت مسکراتی ہے، اسی لیے تو تمہارے ذہن میں اس کا مسکراتا ہوا چہرہ بسا ہوا ہے۔"

پرنس کھڑے، کھڑے مان گیا کہ عمر اور تجربے کا کوئی نعم البدل نہیں...... واقعی اس کے ذہن کے پردے پر زارا کا مسکراتا ہوا ہی تصور ابھرتا تھا۔

''آنکھوں سے لگتا ہے ذہین بھی ہوگی۔'' لیڈی صوفیہ ہنوز اسکیچ میں محو تھیں۔

''گرینڈ مام آپ نے آسکر وائلڈ کو بہت پڑھا ہے...... مگر میں نے تھوڑا کم پڑھا ہے۔ آسکر وائلڈ نے ایک بہت خوب صورت بات کہی...... جو میری میموری سے کبھی نہیں نکلتی......'' پرنس گہری سانس لے کر مسکرایا۔

''اوہ شیور...... میں ضرور سننا چاہوں گی کیونکہ جتنا میں جان چکی ہوں اس سے زیادہ بھول چکی ہوں۔''

''آسکر وائلڈ نے زندگی کے ایک بہت حسین رخ کی طرف متوجہ کیا ہے، کہتا ہے women are met to be loved ,not to be understand (عورت پیار کرنے کے لیے ملی ہے سمجھنے کے لیے نہیں)...... سو عورت کے لیے بس اتنا کافی ہے کہ وہ عورت ہے۔'' پرنس نے یہ کہہ کر بہت آہستگی سے شیٹ لیڈی صوفیہ کے ہاتھوں سے لے لی۔

وہ اپنے اس اتفاق پر حیران ہوئے جارہا تھا کہ اس نے لاشعوری طور پر جو پہلے اسکیچ بنایا تھا، وہ سفینہ کا بنا تھا زارا کا نہیں دادی چونکہ آنکھیں بند کیے ہوئے تھیں اس لیے اس نے وہ شیٹ جلدی سے اتاردی تھی اور ذہن پر اس شوخ لڑکی کا تصور لایا جس نے اس سے آٹوگراف لیا تھا یوں زارا کا اسکیچ غیر ارادی طور پر دادی کو فوری مطمئن کرنے کے لیے بن گیا تھا۔ کیا اس کے ذہن کے کسی خانے میں سفینہ تھی؟

''اُف تم نے کیا یاد دلایا...... پتا نہیں کیا، کیا recall ہونے لگا ہے۔ مجھے Maya Angelou کی ایک بات یاد آگئی۔ پرنس تمہیں معلوم ہے۔ Maya نے تقریباً سات آٹو بایو گرافی لکھی ہیں۔'' لیڈی صوفیہ نے اپنی نیند سے بوجھل آنکھوں سے پرنس کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔

''جی...... گرینڈ مام...... آف کورس...... آپ مایا کی کوئی خوب صورت thought شیئر کررہی تھیں۔'' پرنس نے یاد دلایا۔

''اوہ...... یس...... میں بات کرتے کرتے بھول جاتی ہوں۔ ہاں، میں یہ کہہ رہی تھی کہ مایا ایک جگہ لکھتی ہے۔ A bird doesn,t sing because it has an answer, it sings because it has a song.(ایک پرندہ اس لیے نہیں گاتا کہ وہ جواب دے رہا ہے، وہ اس لیے گاتا ہے کہ اس کے پاس گانے کے لیے ایک گیت ہے)

اللہ کی ہر تخلیق کے ذمے کوئی نہ کوئی کام ہے، عورت کا کام محبت کرنا اور محبت کو پھیلانا ہے۔ مجھے دیکھو...... گزشتہ seventy years سے بس اپنا ہی کام کیے جارہی ہوں۔'' لیڈی صوفیہ اصل ٹریک سے ہٹ کر پھر اپنے محبوب کے تصور میں کھوگئیں تو پرنس نے اللہ کا شکر ادا کیا اور بہت محتاط انداز میں شیٹ ٹیبل پر رکھ دی۔

''اب سوتے ہیں، آج آپ بہت لیٹ ہوگئیں...... شاید صبح کو وقت پر نہ جاگ سکیں۔'' اس نے آگے بڑھ کر دادی کا ہاتھ بہت نرمی سے تھامتے ہوئے کہا۔

''ڈونٹ وری...... '' میری آنکھ خود بخود کھل جاتی ہے۔ ایک پنڈولم میرے اندر اپنا کام کرتا رہتا ہے۔'' وہ نقاہت بھرے انداز میں کھڑی ہوکر گویا ہوئیں۔ پرنس نے بہت محبت سے انہیں شانوں سے تھام لیا اور باہر نکلتے ہوئے تیز روشنیاں گل کردیں۔

☆☆☆



تاجور کو کسی کے پاس بنفسِ نفیس جانے کی تو ضرورت ہی نہیں تھی۔ آفس میں بیٹھے، بیٹھے تین چار باا‌ثر لوگوں سے رابطہ کیا اور کار چھن جانے کی تفصیلات بتا کر ان کو گویا کام سے لگا دیا...... یہ وہ لوگ تھے جن کے شیئرز تاجور کی کمپنی میں لگے ہوئے تھے۔ ساتھ، ساتھ سرکاری محکموں میں اہم عہدوں پر بھی فائز تھے۔

انہیں کار چھن جانے کا اتنا غم نہیں تھا جتنی فکر اس بات کی تھی کہ سفینہ نے کئی دن کی سوچ بچار کے بعد یہ کار پسند کی تھی۔ کیونکہ اسے پہلی بار اپنی ذاتی کار مل رہی تھی۔ کار گھر میں آنے کے بعد جو خوشی کی کیفیت اس کی آنکھوں سے جھلک رہی تھی گویا وہ اس کے کسی دیرینہ خواب کی تعبیر تھی۔

وہ خواہ دو تین دن کی چھٹیوں میں گھر آتی پر ایک دن خود ڈرائیو کر کے شاپنگ سمیت کئی چھوٹے چھوٹے کام نمٹاتی تھی۔ اور جب کار پورچ میں کھڑی کر کے اندر آنے لگتی تو ایک بھرپور تفصیلی نظریوں اپنی کار پر ڈالتی گویا کوئی بادشاہ اپنے اصیل عربی گھوڑے کی بلائیں لے رہا ہو، یہ منظر دیکھنے کا اتفاق یوں ہوا تھا کہ وہ بھی کئی بار سفینہ کی ڈرائیونگ دیکھنے کے لیے یا جانچنے کے لیے اس کے ساتھ بیٹھی تھیں۔

”جب وہ یہ خبر سنے گی تو اس کے دل پر کیا گزرے گی؟“ بحیثیت ایک ماں...... انہیں سفینہ کی روحانی اذیت کا احساس کر کے بہت تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ جتنی زیادہ تکلیف تھی اتنا ہی رہ، رہ کر زرار پر غصہ آ رہا تھا۔

"اس لڑکی کی یہ حرکتیں اب نا قابلِ برداشت ہوتی جا رہی ہیں...... کسی چیز کو سیریس نہیں لیتی...... زندگی کو ہنسی کھیل سمجھا ہوا ہے...... یہی عمر ہوتی ہے جب لڑکیوں میں تھوڑی بہت سنجیدگی اور احساسِ ذمے داری پیدا ہو جانا چاہیے۔ ماں تو بہت کچھ برداشت کر لیتی ہے۔ لیکن ماں تو ایک ہی ہوتی ہے...... حد سے زیادہ پیار کرنے والا کوئی بھی ذی نفس ماں کی برابری نہیں کر سکتا۔ آج اس کی شادی کر دوں تو یہ روز دنیا کے سامنے شرمندہ کرائے گی۔ یہ برانڈڈ اسکولوں کے پڑھے ہوئے زیادہ تر بچے اسی طرح اوور کانفیڈنٹ ہوتے ہیں......" اب ان کا غصہ جھلاہٹ میں تبدیل ہو کر برانڈڈ اسکولوں پر اترنے لگا۔

"لیکن کیا کریں...... اس سوسائٹی کا ڈبل اسٹینڈرڈ...... عام اسکول میں تعلیمی معیار اتنا گرا ہوا ہے کہ وہاں سے نکل کر بچے زندگی بھر رُلتے ہی رہتے ہیں۔ بچوں میں اعتماد ہی نہیں ہوتا...... branded اسکول یورپ اور یو ایس کو فالو کر رہے ہوتے ہیں۔ بچہ پاکستان میں ہوتا ہے، جہاں اکثر ماں، باپ کو تربیت کی فکر ہی نہیں ہوتی۔ اس بات پر پھولے نہیں سماتے کہ وہ اپنے بچوں پر بھاری سرمایہ invest کر رہے ہیں اور بچے فراٹے سے انگریزی بول رہے ہیں۔" وہ اپنا بھی کڑا احتساب کرتی تھیں...... اپنی ان کوتاہیوں پر کڑھتی تھیں جو انہوں نے مجرمانہ غفلت کی وجہ سے نہیں کی تھیں۔ شوہر کا پھیلا ہوا بزنس انہیں سنبھالنا پڑا تو ان کے دن رات برابر ہو گئے۔

کروڑوں، اربوں کے اثاثے سنبھالنا، جمے ہوئے کاروبار کو نقصان سے بچانا...... کئی سال تو گویا وہ ایک مشین ہی بن کر رہ گئی تھیں۔

ایک Anglo indian گورنس نے اس دوران بچیوں کو سنبھالا، گھر کا انتظام بھی دیکھا...... وہ بہت مہذب، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور محنتی تھی۔ مگر مذہب کے فرق کی وجہ سے بچیوں میں بہت کمی رہ گئی تھی۔ سفینہ کو مطالعے کا بہت شوق تھا، اس کے اس شوق نے اس پر بہت مثبت اثرات مرتب کیے تھے۔

نمبر ایک یہ کہ کتاب کے ہوتے ہوئے اسے کبھی بہت سی سہیلیوں کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

دوئم...... مطالعے نے اس کی شخصیت میں نکھار پیدا کیا تھا...... وہ اب بہت کچھ جانتی تھی اور جاننے کے اس عمل نے اس میں وہ اعتماد پیدا کیا تھا جو کسی رنگروٹ کو پاسنگ آؤٹ کے بعد اپنے اندر موجیں اڑاتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اندازِ نظر، چال ڈھال، سب کچھ تبدیل ہو جاتا ہے۔ سفینہ کا اصل حسن اس کا اعتماد اور استغنا تھا۔ اس کے کسی بھی ردِعمل میں عجلت نہیں جھلکتی۔ کسی جھیل کے ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح پُرسکون نظر آتی۔

"واقعی وہ بہت مجبور ہے۔ مگر انسان تو ہے ناں...... دکھ اور خوشی کی کیفیات سے عاری تو نہیں ہے۔" تاجور کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ دفتر سے اٹھ کر گھر جائیں اور زارا کی شکل دیکھتے ہی برسنے لگیں...... شکل دیکھتے ہی لازمی غصہ تو ازسرِنو آنا ہی تھا۔ انہوں نے وقت دیکھا رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ آفس کے ماحول میں تو وہ جتنی احتیاط کر سکتی تھیں...... وہ کی تھی مگر انہیں خود ہی محسوس ہو رہا تھا کہ اب ان کی قوت برداشت جواب دے رہی ہے۔

انہیں خاصے سخت اقدامات کرنے ہوں گے۔ انہوں نے خود کو پُرسکون کرنے کے لیے پہلے ٹھنڈا پانی پیا...... پھر کرسی کی پشت سے کمر ٹکا کر چند منٹ گہری، گہری سانسیں لیں۔ سانس کی مشق سے ذہن قدرے پُرسکون ہو گیا۔ ساحل نے بہرحال انہیں ایک بڑی مشقت سے ضرور بچا لیا تھا کہ ایف آئی آر کٹوا دی تھی۔ وہ گھر جانے کے لیے یوں اٹھیں جیسے کندھوں پر پہاڑ دھرا ہو۔

☆☆☆

زارا بار، بار ٹائم دیکھ رہی تھی۔ مہینے میں ایک دو مرتبہ ایسا ہوتا تھا کہ تاجور بہت لیٹ گھر آتی تھیں۔ اس کی ...

وجہ وہ میٹنگز ہوتی تھیں جو غیر معمولی ہوتی تھیں۔ جن کے شروع ہونے کا وقت ہوتا تھا مگر ختم ہونے کا کوئی وقت نہیں ہوتا تھا۔ وہ گروپ آف کمپنیز کی چیئر پرسن تھیں۔ بھاری ذمے داریاں تھیں انہوں نے شوہر کی وفات کے بعد خود سے کوئی نیا کام شروع نہیں کیا تھا۔ یہ سب ان کے مرحوم شوہر کا بنایا ہوا سیٹ اپ تھا جس کو وہ مردانہ وار سنبھالنے میں دن رات لگی رہتی تھیں۔ ایک طرح سے یہ ان کے لیے بہت بڑا چیلنج تھا...... جسے انہوں نے تقدیر کا لکھا جان کر خوش دلی سے قبول کیا تھا۔

زارا کو یہ اندازہ تو تھا کہ آفس میں جو اس کی ''جھاڑ پھونک'' ہوئی تھی وہ تو آٹے میں نمک جیسی تھی۔ اصل جھاڑ جھپاڑ تو تب ہوگی جب تاجور گھر آئیں گی...... ایک تو تھکن سے چور اس پر مستزاد نقصان کے احساس سے نڈھال...... کئی بار اٹھ کر باہر گئی۔ جلے پیر کی بلی کی طرح گھر میں اِدھر اُدھر گھوم کر ماحول کا جائزہ لیا۔

سارے نوکر اپنے، اپنے کوارٹر میں جا چکے تھے۔ خانساماں البتہ اس کی طرح تاجور کے انتظار میں تھا۔ اس کا کوارٹر بھی کچن کے ساتھ ملحق تھا۔ ایک بڑا سا کمرا ساتھ صاف ستھرا واش روم، وہاں ایک پرانے ماڈل کا فلپس کمپنی کا ٹی وی بھی رکھا ہوا تھا۔ جس پر زیادہ تر کوئی نیوز چینل ہی لگا ہوتا تھا۔ وقفے، وقفے سے کوئی بریکنگ نیوز براستہ کچن ہوتی ہوئی لاؤنج تک بھی آجاتی تھی۔

اس وقت بھی انتہائی خاموشی میں کسی اینکر کی آواز گونج رہی تھی...... بنگالی خانساماں زارا کو دیکھ کر گھبرا سا گیا۔

''میم صیب...... ابھی آواز کم کرتا اے......'' یہ کہتے ہی وہ کچن میں غائب ہوگیا۔ زارا کو اس کے کہنے سے دھیان ہوا کہ کہیں ٹی وی بھی چل رہا ہے۔ مگر خانساماں چور کی داڑھی میں تنکے کے مصداق خواہ مخواہ ہی دوڑ لگا گیا۔ وہ کار جو وہ آتے جاتے ''نینوں'' کی طرح دیکھا کرتی تھی...... آج اس گھر کے پورچ میں نہیں تھی۔

ایک احساسِ جرم اسے زنجیر کیے ہوئے تھا...... اس کی اتنی اہلیت نہیں تھی کہ وہ اس نقصان کا کوئی ازالہ کر پاتی۔

اسی لمحے اسے یوں محسوس ہوا جیسے پورچ میں کوئی گاڑی آ کر رکی ہو۔ اس نے اپنے کمرے کی طرف دوڑ لگالی۔

''اماں ہی آئی ہوں گی۔'' کمرے میں پہنچ کر اس نے پھولی پھولی سانسوں کو متوازن کرتے ہوئے سوچا...... اور چپ چاپ بیڈ پر آ کر لیٹ گئی۔ کمرے میں بہت ہلکی روشنی تھی...... اس کے کان باہر آہٹوں پر لگے ہوئے تھے، اس نے جان بوجھ کر دروازہ ادھ کھلا چھوڑ دیا تھا تاکہ باہر کی سرگرمیوں کا پتا چلتا رہے...... دروازہ بند ہونے کی صورت میں باہر سے کوئی آواز اندر نہیں آتی تھی۔

یہ پیش بندی اس ضمن میں تھی کہ تاجور اس کے پاس آ رہی ہوں تو اسے پہلے سے پتا چل جائے تاکہ وہ خود کو سنبھال سکے اور کوئی مناسب جواز پیش کر سکے۔

پھر اس نے قدموں کی آہٹ سنی...... کان کھڑے کر کے اس نے آہٹوں کی سمت کا اندازہ کیا۔

''اوہ گاڈ...... اماں تو اِدھر ہی آ رہی ہیں۔'' اس کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا تاجور کو ہینڈل گھمانے کی ضرورت ہی نہ پڑی...... دروازہ کھلا مل گیا۔

''مجھے پتا ہے تم جاگ رہی ہو۔'' تاجور کی خفا، خفا آواز نے اس کے وجود میں لرزش سی پیدا کی۔

آتے اوسان پھر جانے لگے...... اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''السلام علیکم اماں......''

''میں بہت دیر تک سوچتی رہی کہ تمہیں تمہاری بے پروائیوں کی کیا سزا دی جائے پھر یہی سمجھ میں آیا کہ جب تک تمہاری شادی نہیں ہو جاتی تم خود ڈرائیو نہیں کرو گی...... گھر میں ڈرائیور موجود ہے۔ جہاں جانا ہوا سے بتا دو۔ تمہاری کار بھی اتنی بری نہیں...... میں کل ساحل سے کہوں گی کہ وہ OLX پر ڈال دے...... پہلی اچھی آفر پر سیل کر دوں گی...... پرسوں سنڈے ہے OLX پر بات نہ بنی تو ساحل سے کہوں گی سنڈے بازار لے جائے...... اب تمہیں اپنی شادی پر ہی ماں کی طرف سے کار گفٹ ہوگی...... صبح ڈرائیور تمہیں کالج ڈراپ کر دے گا۔'' تاجور دھیمی آواز میں سزا سنا کر خود کو سنبھالتی واپس باہر نکل گئیں۔ زارا نے کھل کر سانس لی۔

''اماں نے تو مجھے بالکل ''بے کار'' ہی کر دیا۔'' وہ بستر پر اوندھ گئی۔ ''میں نے اپنے کانوں سے ان گناہ گار کانوں سے خود سنا تھا کہ اماں نے اس سال ففٹی لیکس (50lacs) ٹیکس دیا تھا۔ ففٹی لیکس ٹیکس دیا تو پرافٹ کتنا آیا ہوگا......؟ اوہ گاڈ ہم لوگ اتنے سارے فنانس کا کیا کریں گے......؟ آج کل سو، سو سال تو کوئی جیتا بھی نہیں ہے...... اُف حد ہے کنجوسی کی ایک ''ذرا سی'' کار کیا چلی گئی اماں نے اتنی بڑی، بڑی سزائیں سنا دیں۔'' اس نے نرم و دبیز تکیہ سر کے نیچے سے نکال کر سر کے اوپر رکھ لیا۔

☆☆☆

گہرا نیلا سمندر...... چودھویں کا چاند...... اُڑتے ہوئے چکور...... چاند کے نور سے ایک زینہ تخلیق ہوا...... وہ آہستہ، آہستہ زینہ چڑھنے لگا۔ نرم ہلکے بادل اسے چھو، چھو کر ادھر اُدھر اڑ رہے تھے...... اِک بادل کے ٹکڑے نے اس کا چہرہ ڈھانپ لیا...... ایک ایسی ٹھنڈک اسے خوش (راس) آئی جس سے پہلے کبھی آشنا نہ ہوا تھا...... اسے لگا اس کا چہرہ بھیگ گیا۔ اور اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ بے اختیار دونوں ہاتھوں سے گالوں کو چھوا۔

آج اس نے تیس منٹ مراقبہ کیا تھا...... ورنہ وہ روزانہ پندرہ منٹ رات سونے سے پہلے اور پندرہ منٹ فجر کی نماز سے پہلے مراقبہ کرتا تھا۔ اس نے اپنی روح کو بہت سرشار بہت توانا محسوس کیا...... ذہن بالکل صاف و شفاف تھا...... سانسیں بہت متوازن تھیں۔ پوری کائنات محبت کے جام کا استعارہ بن گئی تھی...... یوں جیسے پیالہ چھلک رہا ہو۔

زمان و مکان (time and space) کی حدود سے ماورا جہاں کی سیر نے دنیائے آب و گل کی صعوبتوں، مشقتوں سے بے نیاز کر کے امرت کا پیالہ ہونٹوں سے لگا دیا تھا۔ وہ اٹھ کر اپنی خواب گاہ کی طرف چلا تو اس طرح گویا اس کا وجود کشش ثقل سے آزاد ہو کر ہلکا پھلکا ہو گیا ہو...... وہ اس عظیم تخلیق کو کل سے پینٹ کرنا شروع کر دے گا...... برش آشنا انگلیاں تخلیق کی آنچ سے سلگنے لگیں۔ پرنس مراقبے میں مشاہدہ کیے منظر کے سحر کو اوڑھ کر اپنے بستر پر دراز ہو گیا...... آنکھیں موندتے ہی گہری نیند نے آلیا۔

☆☆☆

ٹڈ ٹرمز ختم ہوتے ہی پانچ دن کی چھٹیاں اناؤنس ہو گئیں۔ ماہین اور سفینہ کے بیگز تو تیار رہتے تھے۔ صبح ہی آن لائن کراچی کے لیے سیٹس ریزرو کرا لیں پھر ناشتے کے بعد خوب لمبی تان کر سوئیں۔

اس مرتبہ دونوں اپنے، اپنے گھر والوں کو سرپرائز دینے کے موڈ میں تھیں۔ اور سوچ، سوچ کر چھوٹے بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھیں۔

ایک ہفتہ کیسے گزارنا ہے، یہ بھی دونوں نے پلان کر لیا تھا۔ سفینہ کا پروگرام تھا اس مرتبہ وہ اپنی تمام پرانی فرینڈز کو جو اولیول کے بعد تتر بتر ہو گئی تھیں' دو تین کی شادی ہو چکی تھی' تین، چار اے لیول کے بعد ٹیچنگ لائن میں چلی گئی تھیں۔ گیٹ ٹو گیدر دے گی۔

ماہین کا پروگرام تھا وہ اپنی چند کزنز اور سفینہ کے ساتھ ایک پورا دن فارم ہاؤس میں گزارے گی۔ سینما جا کر موویز دیکھنے کا بھی پروگرام تھا۔

جو پلان کرلیا تھا اس پر عمل درآمد کرنے کی بے چینی بھی لاحق ہو چکی تھی۔ سہ پہر کو اٹھ کر شاور لے کر ائرپورٹ جانے کی تیاری شروع کردی۔ شام ساڑھے چھ بجے کی فلائٹ تھی' ان کا پروگرام تھا کہ ساڑھے چار بجے وہ ہاسٹل سے روانہ ہو جائیں گی۔

''ممی تو خوشی سے بے ہوش ہی ہو جائیں گی۔'' ماہین اپنے بال ڈرائی کرتے ہوئے سفینہ سے کہہ رہی تھی۔

''کیوں...... تم یوایس سے کراچی جا رہی ہو یا لاہور سے؟'' سفینہ کو اپنا میچنگ دوپٹا عین وقت پر ڈھونڈنا پڑ گیا تھا۔ سارا بیگ نئے سرے سے پھرول کر رکھ دیا تھا۔ ماہین کی کیفیت سے لطف اٹھانے کے بجائے جھلا کر ردِعمل دیا تھا۔

''چاند سے......'' ماہین نے بھی برجستہ کہا تھا۔

''تم سینا کیا چاہتی ہو...... کیا اُدھڑ گیا ہے......؟'' وہ جلدی جلدی برش بالوں میں چلاتے ہوئے بولی۔

''اسے luggage کہتے ہیں، یہ تمہیں سلائی مشین نظر آ رہی ہے؟'' سفینہ دوپٹے کی برآمدگی سے مایوس ہو کر بیگ زپ اپ کرتے ہوئے بولی۔

''میں سمجھی سوئی ڈھونڈ رہی ہو...... اسٹائل تو ایسا ہی تھا......''

''میرا میچنگ کلر کا دوپٹا نہیں مل رہا...... وارڈروب میں بھی چیک کرلیا۔'' سفینہ کا سو فیصد دماغ اپنے لاپتا دوپٹے میں اٹکا ہوا تھا۔

''ارے میرے پاس ہی گرین ہے..... وہ لے لو میچ کر جائے گا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر دوپٹا آخر گیا کہاں؟'' سفینہ کا ذہن دوپٹے سے ہٹ کر نہیں دے رہا تھا۔

''میرا خیال ہے اڑ کر پرنس کے محل میں جا چکا ہے..... میں نے ایک مووی دیکھی تھی..... اوہ گاڈ..... ہیروئن کے ڈریس کا کلر..... اتنا حسین کہ سوچ ہے تمہاری..... جب اس کا دوپٹا اڑ کر ہیرو کے فیس پر جا گرتا ہے..... اُف..... کس طرح پیار سے چوم کر ہوا میں اڑا دیتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ.....'' اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ جبھی سفینہ گھور کر بولی۔

''کبھی، کبھی تو تم پر بولنے کا دورہ سا پڑ جاتا ہے..... ذرا ٹائم دیکھو.....''

''میں ٹائم دیکھتی ہوں تم دوپٹا دیکھو..... فلائٹ مس ہو گئی تو ہزاروں کی چوٹ پڑے گی..... اور ہم ایک دوسرے کا منہ دیکھیں گے۔'' ماہین نے یہ کہہ کر بالوں میں کیچر لگایا۔

''اُف ایک ذرا سا دوپٹا گم ہونے پر تم نے اسپیشل ٹرانسمیشن شروع کر دی..... لوگوں کی کاریں گم ہو جاتی ہیں مگر ان کا کام نہیں رکتا.....''

''کار گم ہو جائے تو آٹو میں بھی بیٹھ سکتے ہیں۔''

''ہاں گدھے پر بھی بیٹھ سکتے ہیں۔'' ماہین نے تیزی سے قطع کلامی کی تھی اور سیل فون پر سفینہ کو ٹائم دکھانے لگی۔

''پھر میں کوئی دوسرا ڈریس پہن لیتی ہوں۔'' سفینہ نے بددلی سے کہا تھا۔

☆☆☆

رت جگے بہت ہیں
سکھ کی نیندیں کم ہیں
اِک ذرا دیر کی زندگی
ہزار ہا لاکھوں غم ہیں
اس بات پر بہت خوش ہوں
اِک ساہوکار کی آنکھیں نم ہیں
ہمارے خون سے چراغ روشن
پھر کہتے ہیں روشنی کم ہے

ساحل نے تک بندی کر کے دل کی بھڑاس نکالی..... آج اس کا انگ، انگ خوشی سے سرشار تھا..... وہ بیس سال پرانے مولٹی فوم کے میٹرس پر یوں دراز تھا گویا اصلی ریشم سے تیار سرپوش چھپر کھٹ پر بچھا ہو..... سر کے نیچے مور کے پروں والا تکیہ ہو..... دائیں، بائیں کنیزیں مورچھل ہلا رہی ہوں۔

''آج میڈم ہائی پوٹینسی کی ٹرنکولائزر کھا کر سوئیں گی۔ ارے مال ہمارا گیا ہے..... جان آپ کی جا رہی ہے۔ کاش اس وقت ''روح'' حاضر کرنے والا عمل ہاتھ لگ جائے تو حبیب جالب کی روح کو حاضر کروں..... اور ان سے کہوں ذرا زور سے سنائیں.....

میں نہیں جانتا، میں نہیں مانتا

اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ رات کے اس پہر..... انگ، انگ میں اتنی ترنگ کیوں ہے؟
خیال کی رفتار کو وہ محسوس کر سکتا تھا۔ مگر آگہی کے نور کو پہچاننے والی نورانی بصیرت سے محروم تھا۔

محرومیوں پر کڑھتے، کڑھتے...... آج ایک سرمایہ دار کے نقصان پر کلیجے میں اِک ٹھنڈک سی اتر گئی تھی۔ علم کی انتہا یہ تھی کہ کچھ اچھا ہوا ہے، برا نہیں...... اس نے دھوم دھام سے کروٹ لی۔ انتہائی پرانا میٹریس ''ماں کی گود'' بنا ہوا تھا لیٹا ہوا بھی تھا...... سمٹا ہوا بھی تھا۔

دیپ جس کا محلات میں جلے
چند لوگوں کی خوشیوں کو لے کر چلے
وہ جو سائے میں ہر مصلحت کے پلے
ایسے دستور کو صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا

وہ سرخوشی میں گنگناتے، گنگناتے نیند کے پاتال میں اترنے لگا۔

☆☆☆

صبح زارا، ماں کے حکم کے مطابق ڈرائیور کے ساتھ کالج چلی گئی تھی لیکن جب کالج سے واپسی پر پتا چلا کہ ڈرائیور کو پہلے آفس جانا ہے، تاجور کو گھر کے لیے پک کرنا ہے تو مارے کوفت کے حالت بری ہو گئی۔ موڈ خراب ہونے کی وجہ سے ناشتا بھی نہیں کیا تھا۔

کالج میں بھی ٹیکو پی کر گزارہ کر لیا تھا...... ریڈ ایپل کا ٹیکو پینے سے تو جیسے بھوک چمک اٹھی تھی۔ آخری پیریڈ لیتے ہوئے بس یہی دل چاہ رہا تھا کہ اُڑ کر گھر پہنچ جائے اور گرم، گرم چپاتیوں کے ساتھ جو مل جائے کھا کر لمبی تان کر سو جائے۔

لینڈ کروزر میں بیٹھ کر اس نے اپنا بیگ ٹٹولا بسکٹ کا ایک پیکٹ مل ہی گیا جو اس نے ازلی بھوکے کی طرح منٹوں میں صفاچٹ کر دیا۔

آفس پہنچ کر پتا چلا تاجور کو باہر آنے میں آدھا گھنٹا لگ جائے گا۔ اچانک کوئی خاص ملاقاتی آ گیا تھا۔ وہ لاؤنج میں موجود نرم صوفے پر نیم دراز ہو گئی...... بے بسی کے احساس سے آنکھیں نم ہونے لگیں...... غلطی تو کی تھی، ماں سے آنکھ ملا کر بات کرنا محال تھا۔

''ایکسکیوزمی...... آپ رائٹ سائڈ کی طرف جائیں تو آپ کو ایک گلاس ڈور نظر آئے گا...... وہ پبک روم ہے، فرسٹ ایڈ کے لیے وہاں سب بندوبست ہے۔'' ساحل کی آواز نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔

"mind your buisness" اس نے معمولی سی جنبش کیے بغیر پٹ سے آنکھیں کھول کر ساحل کو گھورتے ہوئے کہا۔

''بزنس...... دل تو بہت چاہتا ہے ورلڈ وائڈ... میرا بزنس ہو...... پلین میں بزنس کلاس میں ٹریول کروں...... بزنس کلاس ائر پورٹ cab میں بیٹھ کر فائیو اسٹار ہوٹل جاؤں جیسے ہی ہوٹل پہنچوں منیجر قدموں میں تقریباً گر کر کہے...... ''سر آپ کے لیے رائل سوٹ تیار ہے۔''

''مسٹر اپنی اوقات دیکھ کر جوک کیا کرو...... کیا سمجھا ہے تم نے مجھے...... تمہارا اور میرا...... اسٹیٹس فرق ہے...... نظر نہیں آتا؟ ہماری کمپنی کا صرف ایک ایمپلائی...... ہمنہ...

I am next to kin...your 2nd boss, shame on yourself... ایواسٹوپڈ، فولش، نان سینس......'' وہ شدید غصے میں ضرور تھی مگر اتنی احتیاط کر رہی تھی کہ اس کی آواز اونچی نہ ہو...... کہیں تاجور مزید غصے میں آ کر کوئی نئی سزا نہ سنا دیں۔ اتنی کانشس ضرور تھی کہ وہ اس وقت آفس میں ہے۔

ساحل پر تو گویا آسمان ہی ٹوٹ پڑا تھا۔ لفاظی اس کی فطرت ثانیہ تھی...... یا اسے خود پر اتنا اعتماد تھا کہ وہ اپنی سخن طرازی کے باعث جس پر چاہے غالب آسکتا ہے۔ زارا نے ایک پل میں سمندر کے جھاگ بٹھا دیے تھے۔

''آئی ایم سوری، بٹ میں آپ کے آفس میں پیون نہیں ہوں، منیجر ہوں، ایم بی اے میں پوزیشن لے کر یہاں آیا ہوں۔ براہِ مہربانی آئندہ احتیاط کیجیے گا۔ کیونکہ سیلف ریسپیکٹ سب کی ہوتی ہے مائنڈ یو کچھ لوگ قرض معاف کر دیتے ہیں، انسلٹ معاف نہیں کرتے۔ اور آپ کیوں بتا رہی ہیں مجھے اسٹیٹس کا فرق ہے...... یہ کوئی جتانے والی بات ہے؟ دنیا اندھی نہیں ہے۔ میری بائیک اور آپ کی لینڈ کروزر فرق بتانے کے لیے کافی ہے۔'' مارکیٹنگ سپروائزر اور سیتا اپنی، اپنی ٹیبل سے اٹھ کر آ چکے تھے۔ زارا کو احساس نہیں ہوا...... مگر ساحل نے ان دونوں کی موجودگی میں زارا کی لعن طعن سی تھی۔

جوابی کارروائی کرتے ہی ساحل لاؤنج سے چلا گیا تھا...... سیتا اور سپروائزر بھی کھسک لیے کہ زارا اگر ان پر خواہ مخواہ کی چڑھائی کر دیتی تو وہ ساحل کی طرح مقابلہ کرنے کا یارانہ رکھتے تھے۔

زارا تو یوں دم بخود بیٹھی تھی گویا سانپ سونگھ گیا ہو...... چند لمحے سکتے کی کیفیت میں رہنے کے بعد وہ آہستہ سے صوفے پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اور اچانک ہی مختلف قسم کے خدشات نے آلیا ''اگر اس نے اماں سے شکایت کر دی؟ انہیں تو پہلے ہی اس پر رہ، رہ کر غصہ آ رہا ہے۔ مگر وہ غصے کی کسی بھی انتہا پر ہوں زیادہ سے زیادہ اسے کیا کہہ سکتی ہیں؟ مزید کیا سزا دے سکتی ہیں؟'' وہ اپنے ہی خیالات میں بری طرح الجھ گئی اور صوفے کی بیک سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

ساحل اپنی ریوالونگ چیئر پر آنکھیں بند کیے بیٹھا پیشانی انگلیوں سے رگڑتے ہوئے دائیں بائیں جھول رہا تھا۔ کھٹ کی آواز پر پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ سامنے سیتا کھڑی تھی، اس نے پانی کا گلاس ٹیبل پر رکھا تھا۔

ساحل نے شکر گزاری کے جذبات کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اور گلاس اٹھا لیا اور ایک ہی سانس میں پی گیا۔

''تھینک یو......'' اس نے خالی گلاس ٹیبل پر رکھتے ہوئے دھیمی آواز میں شکریہ ادا کیا۔

''more......'' سیتا گلاس اٹھاتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

''نو تھینکس'' انکار کرتے ہوئے وہ اب دراز کھول رہا تھا۔ اپنا مخصوص لیٹر پیڈ نکال کر اس نے بال پوائنٹ سے پیڈ پر لکھنا شروع کیا۔

بن مانگے مل گئی زندگی
مانگے سے ملے نہ بھیک
میری فراست دیوانے کی بڑ
ساہوکار کا ہذیان بھی ٹھیک
ان کے دشنام پھولوں کی ڈال
اپنا لطیف سخن بھی رکیک
مفلس آخر پیدا ہی کیوں ہوا؟

بجا فرمایا آپ نے بالکل ٹھیک
اس نے اشعار لکھنے کے بعد صفحہ پیڈ سے الگ کیا دو تہیں بنائیں اور اٹھ کر سیتا کے پاس چلا آیا۔ سیتا خواہ مخواہ مجرموں کی طرح سر جھکائے بیٹھی تھی۔ ساحل نے تہ شدہ کاغذ اس کے سامنے رکھ دیا۔ سیتا نے چونک کر سر اٹھایا۔
''استعفیٰ......'' اس کے منہ سے بے ساختہ لفظ پھسل گیا...... جیسے بندوق صاف کرتے ہوئے بے ارادہ گولی چل گئی ہو۔
''یہی سمجھو...... میڈم کو دینا...... اور کہنا آج سے میں یہاں available نہیں ہوں۔''
''مسٹر امیر الدین...... میم اس کو قبول نہیں کریں گی...... انہوں نے تو آپ کو کچھ نہیں کہا ناں......؟''
''آپ کو ایک چھوٹا سا کام دیا ہے...... اتنی ساری باتیں نہ کریں۔'' یہ کہہ کر وہ دوبارہ اپنی ٹیبل کی طرف گیا...... لیپ ٹاپ اٹھا کر بیگ میں ڈالا والٹ، سیل فون، بائیک کی چابی دراز سے نکال کر اس طرح باہر کی طرف چلا کہ پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔
سیتا کے لیے یہ بہت دکھ بھرا واقعہ تھا...... اس کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔
''آج کل جاب کدھر ملتا ہے...... مسٹر امیر الدین کو اتنا ایموشنل نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میم یہ resignation کبھی ایکسیپٹ نہیں کریں گی۔'' اس نے تہ شدہ کاغذ کو اٹھایا...... پھر چند لمحے یوں دیکھتی رہی جیسے کسی متبرک تعویذ کو احترام سے دیکھ رہی ہو۔ اسی وقت انٹر کام کی گھنٹی نے اسے افسردگی کے تاریک پردوں سے نکال باہر کھڑا کیا۔
''یس......؟'' اس نے ریسیور اٹھا کر ماؤتھ پیس میں سرگوشی کے انداز میں کہا۔
''ساحل کو میرے پاس بھیجو...... اور کہو Pyramid ٹریڈرز کی فائل ساتھ لائے۔'' تاجور نے معمول کے انداز میں آرڈر پاس کر کے انٹر کام بند بھی کر دیا تھا۔
سیتا لب کشائی کی چاہ میں بس لبوں کو جنبش ہی دے پائی تھی۔ آواز تو ابھی حلق سے نیچے سینے کے اندر ہی اٹکی ہوئی تھی۔ بادل بجلی کا سا عمل تھا...... پہلے روشنی پھر گرج...... اس نے ہاتھ میں پکڑے ''رخصت نامے'' کو سرسری نگاہ سے دیکھا اور سوچتی ہوئی تاجور کے آفس کی طرف چلی۔
دروازہ ہلکا سا پش کیا...... یخ بستہ لطیف ہوا نے استقبال کیا۔ فنکارانہ انداز میں کیا گیا روشنی کا اہتمام...... ہر شے واضح تھی۔ مگر روشنی کا ہر منبع پوشیدہ تھا...... فرش کے کونوں سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ چھت سے پُراسراریت کے ساتھ جھانک رہی تھی...... انتہائی قیمتی و نازک ٹیبل لیمپ سے پھوٹنے والی تیز روشنی براہِ راست ٹیبل کی سطح پر پڑ رہی تھی...... اور صرف ٹیبل کے خاص حصے کا احاطہ کر رہی تھی۔ جیٹ بلیک کلر کی ساڑی میں تاجور کا گندمی سنہرا رنگ یوں جگمگا رہا تھا جیسے اڑتے سیاہ بادلوں کے درمیان چاند......
پیازی ہونٹوں پر لپ گلوز کی چمک تھی۔ شوہر کے دنیا سے جانے کے بعد انہوں نے کبھی شوخ کلر لپ اسٹک سے ہونٹ نہیں رنگے تھے۔ گلے میں باریک سونے کی زنجیر...... کانوں میں ڈائمنڈ کے ٹاپس، سیدھے ہاتھ کی انگلی میں اعلیٰ درجے کے بیضوی ڈائمنڈ کی انگوٹھی، بائیں کلائی میں رولیکس واچ......
بال کمر تک تھے مگر سمیٹ کر جوڑا بناتی تھیں...... سیتا نے کبھی ان کی زلفوں کو پریشان نہیں دیکھا تھا۔ کبھی چھوٹی سی لٹ بھی چہرے کے آس پاس جھولتی نظر نہیں آئی تھی۔ صاف، شفاف، بہترین صحت کا غماز پُرجلال چہرہ......
دل میں اداسی، سامنے حسنِ بارعب، سیتا نے کچھ کہے بغیر ہاتھ میں پکڑا کاغذ مؤدبانہ انداز میں ان کے سامنے رکھ دیا۔

''یہ کیا ہے؟'' صبیح پیشانی پر ہلکی سی شکنیں نمودار ہوئیں۔

''resignation۔'' سیتا نے اختصار سے کام لیا۔

''کیا پرابلم ہے تمہیں......؟'' ان کے انداز میں غصے کے بجائے حیرت تھی۔

''میرا نہیں......میم...... یہ مسٹر امیر الدین نے دیا ہے۔'' سیتا نے مؤدبانہ عرض کی۔

''وہ خود کہاں ہے؟'' تاجور ورطۂ حیرت میں ڈوب چکی تھیں۔

''وہ چلے گئے ہیں......'' سیتا نے جلدی سے جواب دیا۔

''چلے گئے ہیں؟'' تاجور نے یہ کہتے ہوئے کاغذ سیدھا کرلیا تھا۔ سامنے تین اشعار دیکھ کر حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا...... گویا زلزلے کے بعد ''آفٹر شاک۔''

انہوں نے جلدی، جلدی اشعار پر نظر دوڑائی...... پھر سیتا کی طرف دیکھا اور کاغذ اس کے سامنے پھینک دیا۔

"is it resignation" سیتا تو باس کو غضبناک دیکھ کر تھرا گئی...... دس سال پانچ ہزار ماہانہ پر کام کرنے کے بعد یہ تیس ہزار ماہانہ کی ملازمت ملی تھی...... اور پک اینڈ ڈراپ بھی کمپنی دے رہی تھی...... میڈیکل بھی فری تھا...... اوور ٹائم بھی ملتا تھا۔ ایسی شاندار جاب کے تو وہ خواب دیکھا کرتی تھی...... ماں، دو بہنیں اپنے دو بچے...... بھنگ کا شیدائی نکما شوہر...... اسے یہ ملازمت گویا جان سے زیادہ پیاری تھی...... باس کا غصہ دیکھ کر وہ لرز جاتی تھی مبادا ملازمت سے فارغ کردی جائے......

"y...y...yes mam" بہ مشکل حلق سے آواز نکلی تھی۔

''میری اردو اتنی اچھی نہیں ہے۔ پڑھ کر سناؤ مجھے...... کیا لکھا ہے؟'' سیتا نے جلدی سے اٹھالیا۔

''مسٹر امیر الدین نے اردو میں resignation لکھا ہے؟'' ساتھ ہی وہ سوچ رہی تھی۔

لیکن کاغذ پر نظر پڑتے ہی اسے چکر سا آگیا۔

''دس...... سوری میم...... یہ تو پوئٹری ہے...... شاید میں نے غلط پیپر اٹھالیا۔'' سیتا حواس باختہ ہو کر کہہ رہی تھی۔

"I am just coming" کہتی ہوئی باہر کی طرف بھاگی۔

تاجور نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑلیا۔

وہ سیتا پر غصہ کرنے میں کبھی جلدی نہیں کرتی تھیں بلکہ اس پر خاص نظرِ کرم فرماتی تھیں اس کی دو تین وجوہات تھیں۔

نمبر ایک یہ کہ وہ بہت فرض شناس اور اپنے کام میں سنجیدہ تھی۔ دوئم آئے دن چھٹی کی درخواست نہیں دیتی تھی۔ سوئم یہ کہ چہرے سے اتنی عاجزی و بیچارگی ٹپکتی تھی کہ دل میں خود بخود نرم گوشہ پیدا ہوتا تھا۔ اس کے واپس آنے تک انہوں نے آدھا گلاس پانی پی کر خود کو پُرسکون کیا۔ سیتا پہلے سے زیادہ حواس باختہ ہو کر واپس آگئی تھی...... اور ہاتھ میں وہی پہلے والا کاغذ ہی تھا۔

''میم...... یہ وہی ہے......'' وہ بوکھلاہٹ میں آئیں بائیں شائیں کرنے لگی۔

''وہی......؟What do you mean'' انہوں نے ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔

''میم...... یہ ہی وہ پیپر ہے جو مسٹر امیر الدین دے کر گئے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے کوئی اور پیپر نہیں دیا۔'' وہ ہکلانے لگی تھی۔

''تو پھر تم باہر کیوں گئی تھیں؟'' تاجور نے کڑے تیور سے گھورا۔

''میم میں بھی میں نے شاید غلطی سے یہ پیپر اٹھالیا۔'' سیتا نے سیدھی، سیدھی بات کرنے میں عافیت جانی۔
''اس نے کیا کہا تھا تم سے؟'' انہوں نے الجھن بھری نظروں سے دیکھا۔
''بولے یہ میم کو دینا۔'' سیتا نے فوراً جواب دیا۔
''لاؤ مجھے دو......اور جا کر اپنا کام کرو......'' چند لمحے سوچنے کے بعد انہوں نے کاغذ لینے کے لیے ہاتھ بڑھادیا۔
سیتا کی تو گویا باچھیں کھل گئیں۔ کاغذ تاجور کے ہاتھ میں دیا اور باہر کی طرف دوڑ لگادی۔
تاجور نے گلے میں جھولتی نظر کی عینک ناک پر ٹکائی اور بہت توجہ سے اشعار پڑھنے لگیں...... دو تین مرتبہ پڑھنے کے بعد انہوں نے اپنا سیل فون اٹھا کر ساحل کا نمبر ڈائل کیا اور سیل فون کان سے لگا کر کال ریسیو ہونے کا انتظار کرنے لگیں۔ مگر دوسری طرف فوراً ہی ریکارڈنگ شروع ہوگئی تھی۔
''آپ کا مطلوبہ نمبر اس وقت بند ہے، براہ مہربانی تھوڑی دیر بعد کوشش کیجیے۔'' تاجور نے ڈھیلے ہاتھ سے آہستگی کے ساتھ سیل فون ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

فلپائنی ملازمہ نے کھانے کے بعد موسمی پھل بڑے قرینے سے سجا کر پیش کیے۔ لیڈی صوفیہ وائٹ شیفون کی ساڑی میں ملبوس تھیں۔ اوپل جڑا لاکٹ اور اوپل ہی کے ٹاپس اور انگوٹھی پہنے ہوئے تھیں سمندر کے جھاگ جیسے سفید بال جو آج بھی ہیئر ڈریسر سنوارتی تھی۔ اتنے گھنے تھے کہ پہلی نظر میں دیکھنے سے لگتا تھا کہ سر پر دھری ٹوپی پر برف گر گئی ہو۔
''کچھ برس اور ملتے ہیں تو میں ninety کی ہوجاؤں گی...... سنچری سے دس برس پیچھے...... حیرت سی ہوتی ہے میں اس کے بغیر اتنی عمر کیسے گزار گئی۔''
''آپ سنچری سے آگے بھی جاسکتی ہیں۔'' پرنس نے ہاتھ میں پکڑے دودھیا پیالے سے پائن ایپل کا ٹکڑا کانٹے میں پھنساتے ہوئے بہت لطیف انداز میں مسکرا کر اپنی پردادی کی طرف دیکھا۔
''میں تمہارے بچوں کو اپنے گھر کے لان میں کھیلتے، بھاگتے دوڑتے ہوئے دیکھنے کی خواہش مند ہوں...... مگر شاید میری یہ خواہش پوری نہ ہو...... لیکن میں ناشکری عورت نہیں ہوں۔ I am very blessed میں نے اپنے بیٹے اور اس کے بیٹے یعنی تمہارے باپ کو بہت انجوائے کیا ہے۔ میں نے ہمیشہ اپنی شام کو اپنے بچوں کے ساتھ خوب صورت بنایا......اور ان کے ساتھ وقت گزار کر اتنی روحانی خوشی حاصل ہوئی کہ میں seventy کی ہونے کے باوجود fifty کی نظر آتی تھی۔''
''اوہ یس...... مجھے یاد ہے جب میں نے اسکول جانا شروع کیا تو میرے کلاس فیلوز سمجھتے تھے کہ آپ میری مدر ہیں......'' پرنس نے جلدی سے یادداشت میں اپنا حصہ ڈالا۔ (1924ء کے حساب سے لیڈی صوفیہ 90 سال کی ہوچکی تھیں۔ مگر پرنس نے تصحیح کرکے دل شکنی نہیں کی)
''اوہ......'' لیڈی صوفیہ خوش ہوکر کھلکھلا کر ہنسیں۔ ''تمہیں پتا ہے ایسا کیوں ہوا؟'' انہوں نے نفاست سے سیب کا ٹکڑا کانٹے میں پھنسایا اور منہ کے قریب لے جاکر ہاتھ روک دیا۔
''آپ بتائیں......شاید میرے خیال سے آپ اتفاق نہ کریں۔''
''اس لیے کہ جس ایج میں تمہارے گرینڈ فادر مجھ سے جدا ہوئے میری عمر اسی جگہ رک گئی۔ آج بھی جب اپنے بیڈ روم کی ونڈو سے باہر جھانکتی ہوں تو محسوس کرتی ہوں کہ بڑا سا براؤن ووڈن گیٹ کھلے گا اور ایک جیپ گھر

میں داخل ہوگی۔ 1943ء کو وہ جب منٹگمری کے ساتھ افریقا چلا گیا تو میرے دل نے کہا شاید اب مجھے زندگی بھر ایک اذیت ناک انتظار کی کیفیت میں رہنا ہے۔'' بولتے ہوئے آخری لفظ کی ادائیگی تک ان کی آنکھوں سے سوزِ عشق کے چند انگارے آنسوؤں کی صورت ان کے دامن میں گر چکے تھے۔

''پرنس...... my be loved son میرے پاس اب بالکل بھی وقت نہیں بچا...... جلدی سے شادی کر کے اسے لے آؤ...... تھوڑا سا وقت اس کے ساتھ گزار لوں...... اس کو کچھ ضروری باتیں بھی سمجھانا ہیں...... اس کو ریئلائز کرانا ہے کہ میرے خاندان کے بچوں کو وہ کیسے لے کر چلے گی۔ اس کو یقین دلانا ہوگا کہ تمہارے بچوں کو اس فکر سے آزاد ہو کر زندگی گزارنا ہوگی کہ دولت کہاں سے آئے گی...... گزارہ کیسے ہوگا...... یہ روزی، بیوپار کے نفع و نقصان بہت چھوٹی باتیں اور بڑے، بڑے خوف ہیں...... میرے بچے خوفزدہ ہو کر زندگی نہیں گزاریں گے۔ اللہ...... خوفزدہ انسانوں کو wisdom نہیں عطا کرتا...... اور wisdom کے بغیر انسان مویشی ہے...... مجھے یہ سب بتانا ہے ایک بہترین نسل تیار کرنے کے لیے۔ میں اپنے اللہ سے بہت پیار کرتی ہوں...... دیکھو ناں میرے پاس کچھ بھی نہیں ہوتا...... تم بھی نہ ہوتے...... میں کیا کر سکتی تھی؟ میں تو ہمیشہ اس ظلم پر اداس ہوتی رہتی ہوں جو میرے سسر نے کیا تھا...... اس نے humen rights کی خلاف ورزی کی تھی۔ وہ پرائی جنگ ہمارا مسئلہ نہیں تھی...... اس نے اپنے بیٹے کو مجبور کیا......'' پرنس نے آگے بڑھ کر ان کے لرزتے ہاتھوں سے دودھیا پیالہ لے لیا۔ اپنی انگلیوں کی پوروں سے پردادی کے آنسو صاف کیے، ان کی پیشانی پر بہت پیار سے بوسہ دیا۔

جس عورت نے شعوری حالت میں پورے 82،80 برس اس دنیا میں گزارے تھے اس کا اعصابی نظام اب تلخ یادداشتوں کا بوجھ نہیں اٹھا پاتا تھا۔

''کیا ہم آج اس کے گھر اس سے ملنے جا سکتے ہیں؟'' بچوں کی سی معصومیت کے ساتھ انہوں نے پرنس سے سوال کیا تھا۔

پرنس مسکرا دیا...... اس کی ہر ادا میں کمال چنچل جھلکتی تھی۔ اور یہ سہرا اس کی پردادی لیڈی صوفیہ خانزادہ کے سر بندھتا تھا۔

بنیادی طور پر وہ سندھ کے ان باسیوں میں سے تھے جو انیسویں صدی عیسوی میں سندھ سے تعلیم و تجارت کی غرض سے بمبئی، دہلی اور علی گڑھ کا رخ کرتے تھے۔ تعلیم حاصل کرنے کے شوق میں انگریز سامراج کے ساتھ بھی بود و باش ہونے لگی...... انگلستان بھی جانے لگے۔

1857ء کی جنگِ آزادی کے موقع پر اس خاندان نے برطانیہ میں مستقل سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہیں تجارت کی بھی نشوونما ہوئی اور وہاں کی تہذیب کے رنگ بھی چڑھے۔ جیم اسٹونز کے بزنس نے انہیں ثروت کی بلندیوں پر پہنچا دیا...... نیروبی سے خریدے گئے ڈائمنڈز جو پہلی جنگِ عظیم کی وجہ سے کوڑیوں کے مول ان کے ہاتھ لگ گئے تھے...... وہی ان کے لیے پارس پتھر بن گئے۔ ایران میں فائیو اسٹار ہوٹل تعمیر ہونے کے بعد باقاعدہ شاہی خاندان تک سے راہ و رسم ہونے لگی...... زندگی اب شاہانہ طرزِ زندگی کی طرف گامزن ہوگئی تھی۔

1948ء میں وہ اپنے بیٹے دہاج علی اور بھتیجے فواد کے ساتھ پاکستان آگئی تھیں۔ فواد کی ماں طلاق لے کر جا چکی تھی، اس کی دیکھ بھال لیڈی صوفیہ ہی کر رہی تھیں۔ بعد میں وہ واپس انگلینڈ چلا گیا تھا۔ لیڈی صوفیہ نے دہاج علی کی شادی اکیس سال کی عمر میں ہی کر دی تھی کہ وہ فیملی ممبر بڑھانے کی خواہش رکھتی تھیں۔ شادی کے ایک سال بعد ہی پرنس کے والد شہیر علی کی پیدائش ہوئی تھی۔

شہیر علی خانزادہ صرف گیارہ سال کے تھے جب باپ کے سائے سے محروم ہو گئے جو ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ان کے غم میں گھل گھل کر ان کی بیگم عندلیب بھی بسترِ مرگ پر کافی عرصہ رہنے کے بعد انتقال کر گئیں، ان کی موت کی وجہ برین ٹیومر بنی۔ لیڈی صوفیہ نے اب اکلوتے بیٹے کی اکلوتی نشانی کو کمال توجہ و چاہت سے پرورش کیا اور بار ایٹ لا کی تعلیم مکمل ہونے سے پہلے ہی ان کی شادی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ گھرانے کی بے پناہ حسین لڑکی غنچہ گل سے کر دی...... حیرت انگیز طور پر شہیر علی خان کی وفات کی وجہ بھی برین ٹیومر بنی، وہ پرنس شہیر کی پیدائش سے ایک مہینہ قبل ہی اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ کچھ لوگ دنیا میں بڑے سخت امتحانوں کا شعور حاصل کرنے آتے ہیں۔ جس کو Maximum wisdom بھی کہا جا سکتا ہے۔

اگر انسان ہمت ہار دے، حوصلہ چھوڑ دے تو سوائے خودکشی کے کوئی راہ نظر نہیں آتی۔ اور اگر اپنے وجود کی اہمیت، ذمے داری اور محبت کی ارفع قوت کو محسوس کرے تو فطرت کی بے بہا توانائیاں اس کی مدد کے لیے موجود رہتی ہیں...... حسین و جمیل نوخیز بہو جوانی کی بیوگی کو برداشت نہیں کر پا رہی تھی لیڈی صوفیہ خانزادہ کو ان کے خاندان کی خوب صورت نشانی اور عظیم اثاثہ ان کی گود میں دے کر دارِ فانی سے رخصت ہو گئی۔

پرنس شہیر علی خانزادہ کو پہلی گود ہی پردادی کی ملی...... اس کے لیے انہوں نے بہت خوب صورت اعلیٰ تعلیم یافتہ فلپائنی گورنس کا انتظام کیا تھا۔

وہ جتنی جمال پرست تھیں، زندگی اتنا ہی ان کو بدصورت حقیقتوں کے چہرے دکھاتی رہی۔

یوں پرنس، زندگی کا بہانہ بن گیا...... ہمکتے ہوئے بچے نے زندگی کی بھوک بڑھا دی......

یہ میرا خاندان ہے۔ میرا اثاثہ ہے......

میرے خاندان کی بقا کی ضمانت ہے۔

میں دکھوں پر ماتم نہیں کروں گی۔

دکھ تو آ کر جا چکے ہیں۔

میں خدا کے سامنے طویل سجدے کروں گی...... اس بچے کی زندگی اور خوشیوں کی بھیک مانگوں گی۔

روز سیکڑوں فاقہ کشوں کو کھانا پہنچاؤں گی۔ مجھے جینا ہے، بہت سارا...... دیر تک اس بچے کے لیے......

''صدقہ، عمر بڑھاتا ہے، بری موت سے بچاتا ہے......'' سختیاں جھیلنے والی ماں نے کبھی یہ حدیث سنائی تھی بعد میں خود بھی پڑھی تھی۔

ان کے گھریلو ملازمین بہت خوش حال تھے۔ پیٹ بھر کر کھاتا کماتے تھے۔ بہترین اسپتالوں میں علاج معالجہ کراتے تھے ان کے سرونٹ کوارٹرز کشادہ، روشن اور ہوادار تھے۔

وہ کبھی بہانے بنا کر روتے مانگتے نہیں پائے جاتے تھے۔ ان کے بچے پرائیویٹ اسکولوں میں پڑھتے تھے۔

دولت آج بھی دریا کی روانی کی طرح بہتی تھی۔ غیر ملکی تجارتی کمپنیوں میں ان کے شیئرز تھے۔ فارم ہاؤس، فش فارم، ڈیری فارم، مقامی بزنس تھے۔

اور سارا انتظام ان کے تین منیجر سنبھالتے تھے۔ خودکار طریقے سے ٹرانزیکشن ہوتی تھی...... اکاؤنٹ ملٹی پلائی ہوتے رہتے تھے۔

لیڈی صوفیہ جس شاہانہ جلال و پُروقار انداز میں زندگی گزار رہی تھیں ان کا ظاہر دیکھ کر کوئی ان کی شخصیت کے اس رخ کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ دانش کے اس سنہری دروازے کو بوسہ دے چکی ہیں جو کمال کی کٹھنائیوں سے گزرنے کے بعد ہی دکھائی دیتا ہے اور مادیت سے لطف اندوز ہونے کے راز افشا کرتا ہے۔ اور

وہ راز ہے اپنی دولت میں سے بڑی دیانت داری کے ساتھ مفلوک الحال لوگوں کا حصہ نکالنا......

ان کی تو جیولری کی زکوۃ ہی لاکھوں میں نکلتی تھی...... اور یہی سبب تھا کہ دادی اور پوتا ہر پل روحانی مسرت سے سرشار رہتے تھے۔

ان کے اندر نادیدہ خوف کے ڈیرے نہیں تھے...... نیا دن طلوع ہوتا، اسے بھرپور انداز میں گزارتے...... بریک فاسٹ، لنچ، ڈنر تینوں ٹائم بہترین ملبوسات زیب تن کرتے...... اصلی اور مسحور کُن خوشبو کا استعمال لازمی کرتے...... لاؤنج میں صبح شام تازہ پھول سجائے جاتے، کھانے کی دعوت کے بعد مدعو دوستوں کو تحائف ضرور دیتے......ان کا اپنا منفرد اور جداگانہ طرزِ زندگی تھا۔

بہت قریبی دوست ہی ان کے اس خاص طرزِ زندگی سے واقف تھے۔ جو وہ خود بھی اپنانے کی سعی کرتے تھے......دونوں دادی پوتا گویا ایک طلسمِ ہوش ربا کے باشندے تھے۔ حالانکہ یہاں طلسمِ ہوشربائی والی کوئی بات نہیں تھی۔ بالکل سیدھی سی بات تھی۔

مال کی کثرت سے لوگ مال کم ہونے کے خوف میں مبتلا ہو جاتے ہیں......اور زیادہ سے زیادہ جمع کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔ لیڈی صوفیہ کے ہاں مال خرچ ہوتا تھا......اور خرچ ہوتا نظر بھی آتا تھا۔

یہ ایسا بابرکت مال تھا جس میں سے زکوۃ، صدقات، خیرات کثرت سے نکالے جاتے تھے اور نظامِ فطرت کے تحت دُگنا ہو کر ان کی طرف پلٹا دیے جاتے تھے۔

ان کی بہوؤں کو مال اس قدر غیروں پر اڑانا دل سے قبول نہیں تھا مگر وہ ساس کے سامنے زبان نہیں کھولتی تھیں۔ آج دونوں نہیں تھیں لیکن مال آج بھی بڑھ رہا تھا۔

وہ دادی کے سوال کا جواب ایک مسکراہٹ کی صورت میں دے کر اسٹوڈیو میں آ گیا تھا۔

”میں نے گرینڈ مام سے جھوٹ بولا...... شاید پہلی بار......میں ان کا infant کی طرح خیال رکھوں......its my duty میں ان کا asset ہوں تو وہ بھی میری سب کچھ ہیں۔ شادی کرتے نہیں ہیں۔ شادی ہو جاتی ہے......ابھی کسی کی طرف دل نہیں جاتا......اور میں اپنی شادی کو انجوائے کرنا چاہتا ہوں......وہ تو تب ہی کر سکوں گا...... جب کوئی میرے دل میں اترے گی۔“ ایک جھوٹ کے بعد وہ دوسرا جھوٹ بول کر اسٹوڈیو میں آیا تھا کہ ”میں فون کر کے پتا کروں گا کہ ان کی فیملی کا آج کیا شیڈول ہے“۔ تصویر کشی کرنے کا موڈ نہیں تھا۔

اس کا اکلوتا بہترین دوست برونائی میں کوئی پروجیکٹ کر رہا تھا......آج اسے واقعی اس بات پر حیرت ہوئی کہ وہ تنہائی سے لطف اندوز ہونے کے بجائے تنہائی کو محسوس کر رہا ہے۔

☆☆☆

تاجور نے مسلسل فون پاورڈ آف ملنے کے بعد بالآخر سیتا کو طلب کر لیا۔ وہ بیچاری ڈرتی لرزتی حاضر ہو گئی۔

”وہ پیپر تم غلطی سے لے آئی تھیں سیتا، ساحل کا resignation کہاں ہے؟“

”جی......وہ مسٹر امیر الدین نے صرف ایک ہی پیپر دیا تھا...... جو میں آپ کو دے چکی ہوں۔“ سیتا نے تھوک نگلتے ہوئے بہ مشکل جواب دیا۔

”لیکن یہ اس کا استعفیٰ تو نہیں ہے، اس میں تو فضول سی شاعری لکھی ہوئی ہے جس کا سر ہے نہ پیر...... آفس میں اس کی کسی سے کوئی بات ہوئی تھی؟ کوئی لڑائی جھگڑا ہوا ہے؟ کچھ تو ہوا ہے جو تم نے اس کے ریزائن کرنے کی بات کی......وہ آفس سے بھی جا چکا ہے...... اس کا سیل بھی آف ہے......“ تاجور بہت گہری نظروں

سے سیتا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔ تاجور کے نرم اور متحمل انداز نے بہر حال سیتا کا اعتماد قدرے بحال کر دیا۔

''وہ میم ایکچوئیلی زارا میم نے ان کے ساتھ بہت غصے میں بات کی تھی۔'' تاجور کو زوردار جھٹکا لگا تھا۔

''زارا نے مگر یہ اس سارے قصے میں اچانک زارا کہاں سے آ گئی۔'' تاجور کے خاک پلے نہیں پڑا۔

''جی...... زارا میم لاؤنج میں آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ آپ نے ان کو ویٹ کرنے کا بولا تھا......'' سیتا نے مؤدبانہ جواب عرض کیا۔

''اوہ مائی گاڈ......'' تاجور نے اپنی پیشانی پر بے اختیار ہاتھ مارا تھا۔ ''مجھے تو خیال ہی نہیں رہا کہ زارا آفس میں ہے۔ لیکن اس نے ساحل پر کس وجہ سے غصہ کیا...... یقیناً تمہیں وجہ معلوم ہوگی؟ باہر حال میں سب تمہارے سامنے ہوتے ہیں۔'' تاجور نے یہ اضافی جملہ اس لیے کہا تاکہ سیتا بغیر ہچکچاہٹ کے اصل بات بیان کر دے اور کچھ چھپانے کی کوشش نہ کرے۔ کیونکہ وہ مسلسل نوٹ کر رہی تھیں کہ سیتا کے انداز میں اعتماد نہیں ہے۔

''honestly میم مجھے زیادہ نہیں پتا...... بس میں نے زارا میم کی غصے والی آواز سنی تھی...... وہ مسٹر امیر الدین کو ڈانٹ رہی تھیں۔'' سیتا اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی تھی جیسے اب اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔

''ہوں......'' تاجور نے گہری سوچ کے دوران لمبا سا ہنکارا ابھرا۔

''زارا سے کہو گاڑی میں بیٹھے...... میں آ رہی ہوں۔'' چند سیکنڈ سوچنے کے بعد انہوں نے سیتا کو ہدایت دی۔ سیتا باہر چلی گئی۔

''اس لڑکی سے گھر جا کر ہی بات کرتی ہوں۔'' وہ خود کلامی کرتے ہوئے اپنی رسٹ واچ پر نظر دوڑا رہی تھیں۔ میٹنگ تو مقررہ اندازے سے پہلے ختم ہو گئی تھی۔ وہ ضروری ای میلز چیک کرنے میں مصروف ہوئیں تو ذہن سے ہی نکل گیا کہ زارا کالج سے آ کر آفس میں بیٹھی ان کا انتظار کر رہی ہے۔

انہیں دو تین گھنٹے گھر جا کر آرام کرنا تھا کیونکہ رات وہ ایک بہت بڑے فنکشن میں مدعو تھیں۔ آفس سے لیٹ اٹھنے کے بعد کہیں جانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے اسے یہاں بلوالیا تھا کہ ساتھ ہی گھر چلی جائیں گی۔

چھینی گئی کار کا مسئلہ بھی ساتھ، ساتھ چل رہا تھا۔

تسلی دلادینے والے فون تو آ رہے تھے۔ مگر کوئی ٹھوس کارروائی ابھی تک سامنے نہیں آئی تھی۔

انہوں نے اپنا آئی فون اور ہینڈ بیگ اٹھایا اور باہر آ گئیں۔ انہیں دیکھ کر اسٹاف کے لوگ مؤدبانہ اپنی، اپنی جگہ کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ معمولی کی چال کے بجائے خاصی تیز، تیز چلتی جیپ تک آ ئی تھیں۔ وہ جیپ کے اندر داخل ہوئیں تو زارا وڈرو کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی باہر جھانک رہی تھی۔ رخ موڑنے کی ادا سے ہی اس کے آف موڈ کا اندازہ ہو رہا تھا۔ تاجور اسے مخاطب کرنے کے بجائے سیٹ کی بیک سے ٹیک لگا کر اور آنکھیں موند کر بیٹھ گئی تھیں۔ زارا نے کن انکھیوں سے ماں کی طرف دیکھا تھا۔ مگر تاجور کی آنکھوں پر سن گلاسز کا پردہ تھا۔ زارا نے گھبرا کر رخ موڑ لیا کہ مبادا تاجور اسی کی طرف دیکھ رہی ہوں۔

اس کا جی چاہا کوئی ایسی بات کرے جس سے تاجور کے غصے میں خاطر خواہ کمی واقع ہو...... پھر اس کی نظر ڈرائیور کی طرف گئی۔

جانے تاجور جواب میں کیا کہہ دیں...... خواہ مخواہ ڈرائیور کی موجودگی میں سبکی کا سامنا کرنا پڑ جائے۔

بس یہ خیال آتے ہی غنیمت سمجھا کہ اپنی طرف سے کوئی بات ہی نہ کرے..... تاجور یوں بیٹھی تھیں گویا ان کے اور ڈرائیور کے علاوہ کوئی تیسرا وجود ہی نہ ہو۔ اور یہ خاموشی بات چیت سے زیادہ خوفناک تھی۔

☆☆☆

پرنس عصر کی اذان سے چند منٹ پہلے ہی قریبی مسجد جانے کے لیے نکل جاتا تھا..... اذان راستے ہی میں سنتا تھا یہ پوش ایریا کی سب سے وسیع اور بہت خوب صورت مسجد تھی۔

وقت سے پہلے نکلنے کی وجہ سے وہ ہمیشہ سب سے پہلی صف میں نماز ادا کرتا تھا۔

اس وقت اس کے علاوہ دو عمر رسیدہ بزرگ مسجد میں موجود تھے..... پھر اس کی نظر ایک سات آٹھ سال کے پیارے سے بچے پر پڑی، وہ ان دونوں بزرگوں سے الگ تھلگ بیٹھا تھا۔

پہلا خیال یہی آیا کہ یہ بچہ ان دونوں بزرگوں میں سے کسی کے ساتھ آیا ہے۔ عموماً دادا، نانا اپنے بچوں کو ساتھ لے کر مسجد آجاتے ہیں، یہ معمول کی بات کی۔ اس لیے اس نے اپنی جگہ منتخب کرلی۔ بچہ اتنا گم صم اتنا بھولا بھالا معصوم سا دکھائی دیا۔

اپنے فنکارانہ مزاج کے ہاتھوں مجبور ہوکر وہ جمالِ فطری سے فاصلہ نہ رکھ پایا..... مصور کی نگاہ تو ہر شے میں چھپے حسن کو سرسری نگاہ میں بھی جانچ لیتی ہے..... یہ حسن تو عین فطری تھا کہ بچے عین فطرت پر ہوتے ہیں۔ اس نے بچے کے برابر میں کھڑے ہوکر ہی نماز ادا کی۔

نماز ادا کرنے کے بعد وہ دعا میں مشغول ہوگیا۔ مراقبہ کی عادت کی وجہ سے لمحوں میں ارتکاز قائم ہوجاتا تھا۔

اس کی دعا کا انداز اس طرح کا ہوتا تھا۔ گویا قبر میں اکیلا مردہ اللہ سے ہم کلام ہو.......

یکسوئی سے راز و نیاز کرنے کے بعد اس نے چہرے پر ہاتھ پھیرا..... تو اسے محسوس ہوا پہلو میں بیٹھے ہوئے بچے نے ہلکی سی سسکاری بھری ہو..... پرنس نے چونک کر اپنے دائیں جانب دیکھا۔ بچہ آنکھیں بند کیے دعا مانگ رہا تھا۔ گالوں پر آنسو بہہ رہے تھے۔ حساس فنکار کو یوں محسوس ہوا..... گویا کسی نے اس کے شاہکار فن پارے پر سیاہی پھینک دی ہو۔ چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ہاتھ گالوں پر رک گئے تھے..... وہیں جم کر رہ گئے۔

بوڑھا روئے تو بات کچھ سمجھ آتی ہے، بچہ مسجد میں روئے..... تو فراست شرمسار ہوتی ہے۔ اس نے آہستہ سے اپنے ہاتھ نیچے کیے دوبارہ گھٹنوں پر رکھ لیے۔ اتنی بڑی مسجد میں نمازیوں کی صرف تین صفیں تھیں۔ جمعے کو صحن چھوٹا پڑ جاتا تھا..... عیدین کو مسجد چھوٹی پڑ جاتی تھی، مسجد نماز کے بعد فوراً ہی خالی ہوگئی تھی۔ دو چار نمازی تسبیحات پڑھنے میں مصروف دکھائی دیے۔

پرنس نے پھر بچے کی طرف دیکھا..... یہ تو یقین ہو چلا تھا کہ وہ کسی کے ساتھ نہیں ہے، اکیلا ہے کیونکہ چند نمازی جو موجود تھے وہ بعد میں آنے والے تھے..... بچہ ابھی تک دعا میں مصروف تھا..... دعا بہت طویل ہوگئی تھی۔ دعا میں جانے کیا مانگ رہا تھا۔ مگر اللہ سے بھی گویا اسی طرح اصرار کررہا تھا..... جیسے ماں سے ضد کرکے من پسند شے مانگتا ہوگا۔

پرنس مصورِ حقیقی کی وہ تصویر دیکھ رہا تھا جس نے اس کے ''زعم ہنرمندی'' کو صفر کرکے رکھ دیا تھا۔

(جاری ہے)